تعارف کتب

نام کتاب	:	تاریخ فلسفہ اسلام
تصنیف	:	ٹ ۔ ج دوبوئر اردو ترجمہ:
	:	ڈاکٹر سید عابد حسین
ناشر	:	ادارہ ثقافت اسلامیہ ' ۲۔ کلب روڈ '
	:	لاہور ' ۱۹۹۴ء
سن اشاعت	:	۱۹۹۴ء
صفحات	:	۲۰۰ مجلد
قیمت	:	۱۰۰ روپے

یورپ میں اسلامی فلسفہ میں دلچسپی کا آغاز بارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ پہلے پہل طلیطلہ میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ دوسری عربی کتب کے ترجمے بھی کئے گئے ۔ لیکن مترجمین کی زیادہ تر توجہ فلسفہ و حکمت کی کتابوں کی طرف ہی رہی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ سلطنت روما کے زوال کے عہد میں یونانی فلسفہ کی بیشتر کتب ضائع ہو گئی تھیں۔ علمائے یورپ کو جب ان کتابوں کے عربی ترجموں کا پتہ چلا تو فوراً انہیں لاطینی میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس مہم میں کندی' فارابی' ابن سینا اور غزالی کی کتب بھی لاطینی میں ترجمہ ہو گئیں۔ ان کتابوں میں دلچسپی کی بڑی وجہ یورپ کا یونانی فلسفے سے انس تھا جو انھیں ان مسلم حکما میں نظر آیا۔ تاہم اس محدود دلچسپی کی وجہ سے اسلامی فلسفے کے بارے میں ان کا نظریہ بھی متاثر ہوا اور اسے یونانی فلسفے کا چربہ سمجھا گیا۔ یہ کسی حد تک صحیح بھی تھا کیونکہ ان تک مسلم حکما کی صرف وہ کتابیں پہنچی تھیں جو یا تو یونانی فلاسفہ کی کتابوں کے ترجمے تھے یا وہ ان مسلم حکما کی کتابیں تھیں جو ارسطو کے مکتب فکر سے وابستہ تھے۔ انہی کتابوں میں امام غزالی کی کتاب "مقاصد الفلاسفہ" بھی شامل تھی جس میں غزالی نے یونانی فلسفے کے بنیادی افکار کا خلاصہ پیش کیا تھا۔ اس طرح یورپ میں بہت عرصے تک

غزالی کو یونانی فلسفے کا مقلد تصور کیا گیا۔

تیرہویں صدی عیسوی کے یورپ کا سب سے بڑا مسئلہ مذہب اور فلسفے میں تطبیق تھا۔ اس میں تجدد پسند عیسائی مفکرین کو ابن رشد کے افکار سے بہت مدد ملی۔ ابن رشد نے فلسفہ اور شریعت میں ہم آہنگی کو ثابت کیا تھا' ابن رشد کے افکار کے زیر اثر یورپ میں لیٹن ایوے روازم (لاطینی ابن رشدیت) کی فکری تحریک نے جنم لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عقلیت کی تحریک تھی جو کلیسا کے اقتدار کی مخالف تھی' بعض مورخین کے نزدیک یہی تحریک بعد میں تحریک اصلاح کلیسا کی صورت میں دور جدید کی داعی بنی'۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسا کی طرف سے ابن رشد کی بہت شدومد سے مذمت کی گئی ' اسے مذہب کیلئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا۔ تاہم اس بحث و تمحیص کی فضا میں اسلامی فلسفے سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔

انیسویں صدی کے فرانس میں اسلامی فلسفہ کے بارے میں دو رجحان ابھرے ۔ ایک رجحان کی مثال تو امابل جوردین کی کتاب تھی جو ۱۸۱۹ میں شائع ہوئی ۔ جوردین نے یونانی کتب کے عربی تراجم کا جائزہ پیش کرتے ہوئے مسلم حکما کی خدمات کا اعتراف کیا۔ دوسرے رجحان کی عکاس ارنسٹ رینان کی کتاب تھی جو ۱۸۵۲ میں شائع ہوئی۔ اس نے ابن رشد کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے اسے سامی ذہن کی پیداوار بتایا۔ رینان کے بقول سامی ذہن جزئیات کی تفصیل میں جاتا ہے۔ یہ دقیقہ رسی کا شاہکار تو پیش کر سکتا ہے لیکن ان جزئیات میں جمع و ربط پیدا نہیں کر سکتا۔ آریائی ذہن جس نے یونانی فلسفہ تخلیق کیا تجریدی عقل کا حامل ہے۔ اس لئے ترکیب' نظم اور امتزاج کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سامی ذہن طبیعیات میں تو دلچسپی لیتا ہے لیکن مابعد الطبیعیات میں نہیں' چنانچہ رینان نے کہا کہ اسلامی فلسفے نے یونانی افکار کا ترجمہ تو کر لیا لیکن اس پر کوئی اضافہ پیش نہیں کر سکا۔

اسلامی فلسفے کے بارے میں یہی تصور گوبینو' کارل بیکر اور اولیری نے بھی پیش کیا' یہ نظریہ بہت جلد یورپ میں مقبول ہو گیا۔

اس کے بالمقابل بعض یورپی مفکرین ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلامی فلسفے کو یونانی فلسفے کی چھاپ کے طور پر نہیں بلکہ اسکی توسیع کے طور پر دیکھا۔ ان میں سولومن منک کا نام نمایاں

ہے۔ اس نے ۱۸۵۹ میں عرب اور یہودی فلسفے کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے اسے یونانی فلسفے کا تسلسل قرار دیا۔

دوبوئر منک کے کام سے بہت متاثر ہوا' اگرچہ اسے عربی زبان سے براہ راست شناسائی نہیں تھی لیکن اس نے منک اور دوسرے علما کے مطالعات سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی فلسفے کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا۔ ہماری معلومات کے مطابق یورپی زبانوں میں لکھی گئی تاریخ فلسفہ اسلام پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور بقول ڈاکٹر مجید فخری ابھی تک اس سے زیادہ جامع کتاب لکھی نہیں گئی۔ اس کے بعد اس موضوع پر منٹگمری واٹ (۱۹۶۲ء) رچرڈ والزر (۱۹۶۲) ہنری کوربین (۱۹۶۴) اور مجید فخری (۱۹۸۳) نے کتابیں لکھیں لیکن دوبوئر کی کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ دوبوئر کی کتاب جرمن زبان میں ۱۹۰۱ میں شائع ہوئی۔ اسکی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسکی اشاعت کو دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ای آر جونز نے اسے انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۰۳ میں لندن سے شائع کیا۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے جو اس وقت جامعہ ملیہ دھلی میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور یورپی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۹۲۷ میں دھلی سے شائع ہوا' ۱۹۳۸ میں ڈاکٹر محمد عبدالہادی ابوریدہ نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان تراجم سے اس کتاب کی افادیت بھی ظاہر ہوتی ہے اور مقبولیت بھی۔

سید عابد حسین کا اردو ترجمہ بے حد مقبول ہوا۔ دھلی سے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ پھر بھارت حکومت نے ترقی اردو بیورو قائم کیا تو یہ ترجمہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا اور اب تک تین ایڈیشن ۱۹۷۲' ۱۹۷۹ اور ۱۹۸۴ء شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ ایڈیشن اس ترجمے کا پہلا پاکستانی ایڈیشن ہے۔

دو بوئر نے اس کتاب کے مقدمے میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہودی مفکرین پر تو جو در حقیقت فلسفے میں مسلم مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں بہت کچھ لکھا گیا لیکن مسلم مفکرین کے کام کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس نے اسلامی فلسفے کی تاریخ نگاری کے بنیادی سوالات پر پہلی مرتبہ رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفے سے ہی نہیں بلکہ

ایرانی اور ہندوستانی فکر و حکمت سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا۔

دوبوئر نے ایک طویل باب (باب دوم) اس پہلو پر بھی لکھا ہے کہ اسلامی علوم مثلاً علم اللسان، علم الفقہ، علم الکلام اور فلسفے میں باہمی کیا ربط تھا اور انہوں نے ایک دوسرے کی نشوونما پر کیا اثرات مرتب کئے۔

دوبوئر نے ارسطو کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے فلاسفہ کو دیگر فلاسفہ سے الگ کر کے تاریخ فلسفہ کے اس اہم پہلو کی بھی نشاندہی کی کہ اسلامی فلسفہ یک رنگ اور یک جہت نہیں تھا۔ اس کتاب کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس نے اسلامی تاریخ میں مذہب اور فلسفے کی کش مکش کا ذکر کرتے ہوئے غزالی اور ابن رشد کے افکار کا موازنہ بھی پیش کیا اور اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا کہ ابن رشد کے مقابلے میں غزالی کی فکر کو کامیابی کیوں حاصل ہوئی۔ دوبوئر نے اپنی تاریخ کو ابن خلدون کے ذکر پر ختم کیا ہے جس کا ذکر تاریخ فلسفہ کی عام کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے دوبوئر کی کتاب منفرد تھی کہ اس نے تاریخ فلسفہ میں اسلامی فلسفے کے صحیح مقام کے تعین کی کوشش کی۔

ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا ترجمہ بہت ہی عام فہم اور سلیس زبان میں ہے جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ فلسفے کی خشکی کی بڑی وجہ مشکل زبان ہوتی ہے اگر فلسفہ کی کتابیں ایسی ہی عام فہم زبان میں لکھی جائیں تو یقیناً فلسفے کی کتاب بھی دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ ترجمہ پڑھتے ہوئے بہت کم خیال ہوتا ہے کہ آپ فلسفے کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوصف ہم ایک کمی کے احساس کا ذکر ضرور کریں گے۔ ۱۹۹۴ میں اس کتاب کی اشاعت کے وقت اس کی پہلی جرمن اشاعت کو ۹۳ سال اور اردو ترجمے کی پہلی اشاعت کو ۶۷ سال گذر چکے ہیں، اس عرصے میں اسلامی فلسفے کا مطالعہ دوبوئر کے زمانے سے کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اب اسلامی فلسفے کی تاریخ میں علم تصوف، علم اصول الفقہ، علم الکلام اور علم التاریخ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسلامی فلسفے میں حکمت اشراق کی اہمیت کی طرف تو علامہ اقبال نے توجہ دلائی تھی۔ اصول فقہ کے فلسفیانہ پہلوؤں کے مطالعہ کی اہمیت کو برنشوگ نے اجاگر کیا۔

ہنری کوربین نے تصوف اور شیعی فکر کے فلسفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مقدمے یا حواشی میں قاری کی توجہ اس پیش رفت کی طرف مبذول کرا دی جاتی۔

اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں ابن عربی اور فخرالدین رازی کی عدم موجودگی بھی بری طرح کھٹکتی ہے اگرچہ یہ کسی حد تک صحیح ہے کہ امام غزالی کی فلسفہ یونان پر تنقید کی ضرب کا مداوا ابن رشد سے بھی نہ ہو سکا لیکن فلسفے اور عقلیت کی تحریک کی مکمل شکست فخرالدین رازی کے ہاتھوں انجام پائی جس نے علم کلام، فلسفہ اور تفسیر کا ایسا امتزاج پیش کیا جس میں اشعریت پورے عروج پر تھی اور عقلیت کے ان تمام اصولوں کی جو علم تفسیر، علم کلام یا علم اصول فقہ میں کار فرما تھے نفی کی اور فلسفے کو مکمل طور پر علم کلام سے آہنگ کر کے ہر قسم کی فلسفی فکر کا راستہ مسدود کر دیا۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کے سامنے ابو ریدہ کا عربی ترجمہ نہیں تھا، ابو ریدہ نے بیش قیمت حواشی کا اضافہ کر کے اس کتاب کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے اس سلسلے میں انھیں خصوصاً مصطفیٰ عبدالرزاق اور احمد امین کی علمی معاونت حاصل تھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اردو قارئین کو بھی ان ملاحظات سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ خاص طور پر بعض اعلام اور اماکن جرمن سے اردو میں ترجمہ ہو کر غیر مانوس ہو گئے ہیں۔ عربی ترجمے سے ان کی نشاندہی میں مدد مل سکتی تھی۔ مثلاً Edessa کو اردو میں "اذیسا" بتایا گیا ہے جب کہ عربی مصادر میں یہ جگہ "اورفا" یا "الرھا" کے نام سے معروف ہے۔

جدید ایڈیشن میں اشاریہ کے اضافہ سے کتاب بے حد مفید ہو گئی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کن وجوہات کی بناء پر فرہنگ مصطلحات جو دھلی کے ایڈیشن میں موجود تھی خارج کر دی گئی ہے۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں یہ کمی دور کر دی جائے گی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس بیش قیمت کتاب کو پاکستانی قارئین کیلئے اتنی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ پیش کیا۔ یہاں اکادمی ادبیات پاکستان کی علم دوستی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں ان کی معاونت بھی شامل ہے۔

محمد خالد مسعود